مقالات

قسط ۲ آخری

پروفیسر غلام احمد حریری
صدر شعبہ علوم اسلامیہ
زرعی یونیورسٹی
فیصل آباد

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصولِ تعلیم

دینِ اسلام میں علم برائے علم کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا:

"وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ۔" (البقرۃ ۱۰۲)

"کچھ ایسے منتر سیکھتے جو اُن کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔"

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دُعا فرمایا کرتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ۔"

"اے اللہ! میں بے فائدہ علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں!" (صحیح مسلم کتاب الذکر)

الہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو علی ثقفی کا قول نقل کیا ہے:

"اَلْعِلْمُ حَيٰوةُ الْقَلْبِ مِنَ الْجَهْلِ وَنُوْرُ الْعَيْنِ مِنَ الظُّلْمَةِ۔"

"علم جہالت سے بچا کر دل کو زندگی عطا کرتا ہے اور تاریکی سے بچنے کے لیے نورِ چشم کا کام دیتا ہے۔"

پھر فرمایا:

"اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَكْبَرِ" (کشف المحجوب)

"علم بہت بڑا حجاب ہے!"

یہ اُن لوگوں کے بارے میں فرمایا جو صرف رسمی علوم کو کافی سمجھتے ہیں اور معرفت سے دُور رہتے ہیں۔

الہجویری رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:

"انسانی عمر کوتاہ ہے اس لیے ایسے علوم سیکھے جائیں جن سے معرفتِ خداوندی حاصل ہو اور جو مخلوقِ خدا کے کام آئیں۔" (کشف المحجوب)

دینِ اسلام کی نگاہ میں علم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ نیکیاں پھلیں پھولیں، انسانوں کی فلاح و سعادت کے سامان مہیا ہوں اور حکمۃ اللہ تمام عالم پر چھا جائے۔ بے نفع علم اور بے عمل علم حکمتِ قرآنی کے خلاف ہے۔ انہی مقاصد کے پیشِ نظر اسلام کی علمی تحریک نے عالمگیر اثرات پیدا کیے اور باوجودیکہ بیرونی حملہ آوروں نے بار بار اس تحریک کو تہ و بالا کیا مگر قرآن مجید کے گہرے نفوذ کی وجہ سے یہ تحریک ہر بار خود کو از سرِ نو منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتی رہی یہاں تک کہ حملۂ تاتار کی تباہ کن یلغار نے اگرچہ مسلمانوں میں تجربی اور سائنسی اور ریاضیاتی تحریک کو بالکل ختم کر دیا اور ہزاروں سائنس دان اور ان کے محمل برباد ہو گئے۔ تاہم مسلمانوں کی علمی تحریک جدید مغربی غلبے کے آغاز تک شائستگی کردار اور عمومی فلاح و سعادت کا بہت بڑا وسیلہ ثابت ہوئی اور مغرب نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔

قرآنِ کریم میں فرمایا:

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔" (الحدید:۲۵)

"ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے ان پر کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔"

اسلامی تہذیب و ثقافت کے پسِ منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا، ان میں اس مقصد کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔ یہ مقصد تعلیم کے ہر گوشے میں اسلامی نظریۂ حیات کی رُوح جاری و ساری کرنے سے حاصل ہوگا۔ نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطۂ نظر سے کی جانی ہوگی۔ اس کے لیے تمام تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیلِ نو اور ایک ایسے ماحول کی تشکیل بھی کرنا ہوگی جو ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو۔

بے مقصد تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر اُبھارتے

ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنھوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وُہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وُہ نقشِ پا کی طرح مٹا دی گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرگِ فرد از خشکی رودِ حیات

مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

بے مقصد تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے۔ رُوح کے مطالبات سے یہ بے گانہ وار گزر جاتی ہے۔ دونوں کی نشوونما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور راہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محورِ دل ہو۔ ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لیے سانپ جلیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا رُوم فرماتے ہیں:

علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود

سچی بات یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی، حقیقی، واقعی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی۔ قومی نقطۂ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ڈاکٹر فرینک ایڈی لوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے کہ یہ تعلیم:

"مقاصد کی بجائے تیکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو آزادی سے محروم کر رہی ہے۔" ؎ل

ل A dylote frank "Breaking the academic lock step, harper and brothers, New york, 1944, P. 7.

۳۔ تعمیرِ سیرت و کردار:

تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہونی چاہیے تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد کبھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اولین اہلیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی بیک وقت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تزکیہ، یعنی انسانی زندگی اور رُوح کی تطہیر، شامل ہے، اور اسے اوّلیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسکول اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کام تعلیم کا ہے کہ وُہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے، امام غزالی لکھتے ہیں:

"تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا چاہیے"! (احیاء للغزالی)

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں بھی ہے:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"

"تمہارے لیے رسولِ کریم ﷺ کی ذات میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے"

(الاحزاب ۲۱)

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں۔ استاد کو خود اپنی زندگی اور اپنے کردار اور عمل سے طالب علم میں نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے اور درس گاہوں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں ممد و معاون ہو سکے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مردم سازی اور آدم گری کا کام اس سطح سے شروع کیا جہاں سے کسی نبی یا مصلح کو نہیں کرنا پڑا تھا اس لیے کہ عام طور پر دیگر انبیاء کی قوموں کی معاشرتی سطح زمانۂ جاہلیت سے بہت بلند تھی اس کے باوجود آنحضرتؐ نے اپنے

اس تعلیم کام کو اس سطح تک پہنچا دیا جو انسانیت کی انتہائی منزل ہے اور جس کے بعد نبوت کے سوا کوئی اور درجہ نہیں اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ختم کر دیا گیا۔

رسولِ کریم ؐ نے اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے ایسے صالح افراد پیدا کیے جو خدا پر ایمان رکھنے والے، دین دار و امانت دار، دُنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے اور مادیت کے مظاہر کو نظرِ حقارت سے دیکھنے والے تھے۔ انہی اینٹوں سے اسلامی معاشرہ کی عمارت بنی تھی اور اسلامی حکومت انہی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں قائم ہونے والا یہ معاشرہ جسے آپ کی تربیت نے کندن بنا دیا تھا، انسانیت کی پوری تاریخ میں بہترین انسانی معاشرہ ثابت ہوا جو تمام انسانی محاسن کا جامع تھا۔ اس معاشرے کا تعارف اس کے ایک فرد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بڑے بلیغ اور معنی خیز الفاظ میں اس طرح کرایا ہے:

"وہ لوگ تمام لوگوں میں پاکیزہ ترین دل، عمیق ترین علم اور کم سے کم تکلف والے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ؐ کی صحبتِ بابرکت اور دین کی سربلندی و نصرت کے لیے انتخاب فرمایا تھا۔"

(مسند دارمی)

۴۔ تکمیلِ حیات:

رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے صحابہؓ کے اذہان و قلوب میں اس حقیقت کو جاگزیں کیا کہ اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کو زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہیے اور معاشرے کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہیے۔

اسلام رہبانیت کا قائل نہیں، اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشاکش کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ اپنی زندگی گزار دے۔ قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کی تلقین کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی عنایات سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ الآیۃ" (الاعراف: ۳۲)

"ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیر رکھا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں کھانے پینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے جو اس نے ان کے لیے بنائیں۔"

اسلام کی نظر میں انسانی محنت و مشقت نہایت ہی قابلِ قدر ہے۔ اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بناتا ہے۔ پس تعلیم کو دیانتدارانہ، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں ممد و معاون ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی، سماجی، سائنسی اور فنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ ان ضروریات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لیے مثبت طور پر کام کرنا چاہیے۔ تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔

تعلیم عہدِ رسالت میں:

مذکورہ صدر تفصیلات کے بعد اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ معلمِ اوّل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم کے سلسلہ میں کس طرز و انداز کو اپنایا۔ نیز یہ کہ تعلیم کی تاریخی روایت عہدِ رسالت میں کن مراحل و ادوار سے گزر کر پروان چڑھی؟

ظہورِ اسلام سے پہلے قبیلۂ قریش میں صرف سترہ افراد ایسے تھے جنھیں لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ نئے مذہبی اور سیاسی نظام کی ضروریات کے پیشِ نظر تعلیم یافتہ افراد کی شدید ضرورت تھی، چنانچہ آغازِ اسلام کے وہ مسلمان جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے رسولِ کریمؐ کے کاتبانِ وحی مقرر کیے گئے۔ تعلیمی خدمات کے سلسلہ میں غیر مسلموں کی خدمات سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے چند قیدیوں کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ فدیہ کے طور پر مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

(فتوح البلدان بلاذری ص ۴۷۱، الکامل للمبرد ج ۱ ص ۱۷۱)

آپؐ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحابِ صفہ اولین تلامذہ تھے۔ یہ اولین مدرسہ اب مسجدِ نبوی کے اندر شامل کر لیا گیا ہے اس مدرسے میں ستر اسی کے قریب طلبہ تھے۔ انہوں نے دنیوی مشاغل کو خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو تحصیلِ علم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ ۲۴ دوسرے صحابہ کبار

بھی یہاں معلّم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے۔ اصحابِ صفہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ مالی امور کے نگران تھے اور عطیات کی تقسیم کا کام انہی کے سپرد تھا، ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لیے مامور کر دیے جاتے تھے اور تعلیم و تبلیغ کے لیے تو خصوصیت سے انہی اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے اور دوسرے اہلِ ثروت مسلمان بھی ان طلبہ اور ان کے متعلمین کی مقدور بھر مدد کرتے تھے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی مدد فرمایا کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہودیوں کی زبان عبرانی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فارسی زبان کسرےٰ کے قاصد سے، رومی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حاجب سے اور حبشی اور قبطی آپؐ کے خادم سے سیکھی تھی۔

اس سے عربوں میں دوسری زبانیں سیکھنے کا رواج پیدا ہوا۔ کتبِ حدیث میں یہ روایت ملتی ہے کہ "حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مختلف زبانیں بولنے والے بہت سے غلام تھے اور وہ ان سب سے ان کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔" (مستدرک حاکم حالات ابن زبیرؓ۔ عقد الفرید)

صحابہ کرام کے ابتدائی دور میں احادیث کی کتابت کا آغاز ہو گیا تھا۔ تابعینؒ کے زمانہ میں اس کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو گیا۔ چنانچہ سابق الذکر حضرت زید بن ثابتؓ نے علمِ وراثت میں ایک کتاب تالیف کی تھی۔ بکثرت صحابہؓ نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے فیصلے ایک کتاب میں مرتب کیے۔ ہشام بن عروہ کا بیان ہے کہ "حرّہ کے معرکہ میں میرے والد کی فقہ کی چند کتابیں جل گئیں جو مجھے اپنے اہل و عیال اور مال و دولت سے عزیز تر تھیں۔" حرّہ کا واقعہ ۶۳ھ میں پیش آیا۔ اس لیے یہ کتابیں لازمی طور پر اس سے پہلے مرتب ہو چکی ہوں گی۔

مذکورہ صدر بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلفائے راشدین ہی کے زمانہ میں تالیفِ کتب اور تدوینِ علوم کا آغاز ہو گیا اور دورِ جاہلیت کی طرح محض حافظہ پر اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ کاغذ کے حصول میں جو مصر میں کسی پودے کے گودے سے بنتا تھا جس قدر سہولت ہوتی گئی اسی قدر علمی کتابیں زیادہ پھیلنے لگیں۔ آغازِ اسلام میں چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہودِ خیبر کے ساتھ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معاہدہ اور کسرےٰ

کے نام آپؐ کا نامۂ مبارک چمڑے پر تحریر کئے گئے تھے۔ جب تک کاغذ کا رواج نہیں ہوا تھا، اس وقت تک قرآنِ مجید ہرن کی کھال پر لکھے جاتے تھے۔ جس قدر تالیف و تدوین کے اسباب و وسائل فراہم ہوتے گئے۔ اسی قدر قراء، حفاظ، ادباء، رواۃ اور لغویوں کی کی تعداد بڑھتی گئی۔ مختلف شہروں میں میدانِ علم میں مسابقت شروع ہوگئی اور ہر شہر اسلامی ثقافت کی تحصیل کے لیے سبقت کرنے لگا۔

اس طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلامی مملکت میں تعلیم کی نہج قائم کی، جو روایت اس میں قائم ہوئی اس کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ مدینہ طیبہ کے اولین مدرسۂ نبوت میں صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ نصابِ تعلیم میں کتاب و سنت مرکز و محور کی حیثیت رکھتے تھے۔

۲۔ تعلیم کا مقصد اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا اور مسلم معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔

۳۔ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ قرار پائی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین بنے۔

۴۔ متعلمین کے لیے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود محنت مزدوری کرنا اور مختلف صنعتوں کو سیکھنا اور اُن سے وابستہ ہونا مستحسن اور پسندیدہ قرار پایا۔

۵۔ تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اسی مقصد کے لیے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیرِ تعلیم طلبہ اور ان پر اٹھنے والے جملہ مصارف کا ہے۔

اب ان نکات کی تھوڑی سی تفصیل بیان کی جاتی ہے:

تعلیم اور مسجد کا تعلق:

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا، آغازِ اسلام میں مسجد کو درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی اور یہ حیثیت عرصۂ دراز تک اگلے تاریخی ادوار میں بھی قائم رہی۔ چونکہ ابتدائی چند صدیوں میں مسلمانوں کی تعلیم علومِ دینیہ تک محدود رہی اس لیے مساجد جو عبادت گاہیں بھی تھیں، اس کام کے لیے موزوں تصور کی گئیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ

جاتے ہوئے شہر سے باہر مسجد قبا کی بنا ڈالی۔ یہ اسلام میں اولین مسجد تھی۔ جب حضورؐ مدینہ پہنچے تو آپؐ نے المربد میں مسجد نبویؐ کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد میں آپؐ نے صحابہؓ کو تعلیم دینے کا آغاز کیا۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۱۔ الطبری ج ۱، ۳ ص ۱۲۵۹ فتوح البلدان بلاذری ص ۲۰)

مساجد اس زمانے میں سیاست کے مراکز تھیں، انصاف کی عدالتیں تھیں، تعلیمی درسگاہیں تھیں۔ جوں جوں اسلام پھیلتا جا رہا تھا مسجد کی بناء لازمی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بصرہ، کوفہ، شام اور مصر کے گورنروں کو ہدایات بھیجی تھیں کہ کم از کم ایک جامع مسجد ہر شہر میں تعمیر کی جائے تاکہ سب لوگ جمعہ کی نماز وہاں پڑھا کریں۔ چنانچہ مساجد کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ مورخ یعقوبی کا دعوے ہے کہ اس نے تیسری صدی ہجری میں صرف بغداد میں تیس ہزار مساجد شمار کیں۔ (الخطط مقریزی ج ۲ ص ۲۱۶۔ حسن المحاضرۃ سیوطی ج ۲ ص ۱۴۹، یعقوبی ص ۲۵۰)

تعلیم کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل مساجد نے عالمگیر شہرت حاصل کی:

۱۔ جامع المنصور:

بناء بغداد کے بعد ۱۴۵ھ میں اس جامع کی تعمیر شروع ہوئی، اس منصوبہ پر اٹھارہ کروڑ دینار صرف ہوئے۔ یہ مسجد ایک نہایت ہی اعلیٰ مدرسہ تھا اور تمام اہل علم کا مرکز تھا۔ یہ اتنا عظیم مدرسہ تھا کہ خطیب بغدادی نے حرم شریف میں جن تین باتوں کے لیے دعا مانگی تھی ان میں سے پہلی بات یہ تھی کہ انھیں اس مدرسہ میں پڑھانے کا موقع نصیب ہو۔ پانچویں صدی ہجری میں حنبلی طلبہ نے اس مدرسہ کو اپنی سرگرمیوں اور تعلیم کا مرکز بنا لیا تھا۔ مشہور نحوی الکسائی بھی اس میں درس دیا کرتے تھے۔ اور ان کے درس میں الفراء، الاحمر اور الاخفش کے درجہ کے لوگ شرکت کیا کرتے تھے۔ (معجم الادباء یاقوت ج ۱ ص ۲۴۶ نیز ج ۴ ص ۲۷۳)

۲۔ جامع دمشق:

اس جامع کا شمار قرونِ وسطیٰ کے چار عجائبات میں کیا جاتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنی سلطنت کے سالانہ محاصل سے سات گنا رقم صرف کی۔ مسجد کی تعمیر میں آٹھ سال صرف ہوئے۔ اس کی تعمیر سے متعلق کاغذات اٹھارہ اونٹوں پر لاد کر بھیجے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں سو سال بھی قیام کرے تو روز ایک نہ ایک نئی چیز اس کے مشاہدہ میں آئے گی۔ یہ مسجد ایک تعلیمی مرکز تھی۔ مشہور سیاح ابن جبیر کا بیان

ہے کہ اس مسجد میں درس کے متعدد حلقے قائم تھے اور اساتذہ کے لیے معقول مشاہرہ کے علاوہ خورد ونوش کا بھی انتظام تھا، مالکی طلبہ مغربی گوشہ میں مالکی علماء سے سبق لیتے تھے۔ داخلی دروازہ کے بائیں جانب ایک شافعی مدرسہ تھا۔ خطیب بغدادی کا حلقہ۔ درس بہت وسیع تھا جہاں بے شمار سامعین ہوتے تھے۔

(معجم البلدان، یاقوت ج ۴ ص ۷۶، الرحلۃ ابن جبیر ص ۲۷۲، معجم الادباء، یاقوت ج ۱ ص ۲)

۳۔ جامع عمرؓ:

اس مسجد کی تعمیر ۲۱ھ میں ہوئی اور بعدازاں متعدد بار توسیع کی گئی۔

المقریزی کے عہد تک اس مسجد میں بڑے بڑے فضلاء درس دیا کرتے تھے۔ اس کے ایک گوشہ میں امام شافعیؒ طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس میں ادبی مجالس بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔

غرض یہ کہ اس عہد میں مساجد ہی عربوں کے مختلف علوم کا مرکز تھیں۔ مساجد میں ادبی تحقیق کا کام بھی ہوا کرتا تھا۔ مشہور تابعی سعید بن المسیب مدینہ کی مسجد میں عربی شاعری پر بحث کیا کرتے تھے۔ ابن طولون کی مسجد میں تفسیر، حدیث، فقہ اور علمِ ہیئت پر تحقیقی کام ہوا کرتا تھا۔ عبداللطیف بغدادی بیان کرتے ہیں کہ میں جامع ازہر میں صبح وشام درس دیا کرتا تھا۔ دوپہر کو ایک طبیب آتے اور علمِ طب پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ (الاغانی ج ۱۵ ص ۱۱۳، ابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۲

المقریزی، ج ۱۵ ص ۲۵۴)

ادوارِ مابعد میں تعلیم: عروجِ اسلام کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تعداد بھی بڑھتی جارہی تھی۔ تعلیمی حلقوں میں اضافہ کی وجہ سے مساجد میں نماز کے اوقات میں گڑبڑ واقع ہونے لگی، عبادت گاہوں میں شور وشغب کی گرم بازاری رہتی۔ جب کہ مسجد میں خاموشی اور تقدس کا لحاظ ضروری تھا۔ ان حالات میں تعلیم کا مسجد سے مدرسہ کی طرف منتقل ہونا قدرتی بات تھی۔ مشہور مستشرق وان کریمر رقمطراز ہیں:

"علم کی توسیع و ترقی کے باعث ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی جس کے لیے محض علمی فضیلت کی خاطر معقول زندگی بسر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ علم کی مزید توسیع اور ان حضرات کے لیے وظائف کا انتظام کرنے کی غرض سے مدرسے قائم کیے گئے۔" (اسلامک سولائیزیشن ص ۲۵۸)

مدارس: یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ یہ نظام اتنا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے پانچ لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں، جو مساجد میں تعلیم دیا کرتے تھے۔

دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ بڑے وسیع پیمانے پر باقاعدہ مدارس قائم ہوئے۔ ان مدارس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ ہر مدرسہ میں عصرِ حاضر کی طرز پر ایک لیکچر ہوا کرتا تھا۔ اکثر مدارس سے ملحق سکونتی مکانات بھی ہوا کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصابِ تعلیم وغیرہ تھے، سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ۴۱۰ھ مطابق ۱۰۱۹ء میں قائم کیا۔ ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے:

"مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا۔ اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا۔ مسجد و مدرسے کے اخراجات کے لیے بہت سے دیہات وقف کیے۔" (تاریخ فرشتہ ج ۱، حالات سلطان محمود غزنوی)

محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کیے۔ اس کے زیرِ اثر دوسرے امراء اور ارکانِ دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفریں اقدام اس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا، دولتِ سلجوقیہ کے مشہور وزیرِ اعظم نظام الملک طوسی المتوفی ۴۸۵ھ کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمین اور امام غزالی جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، اس کے بعد مدارس کی ایک رَو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمرو میں ان کا جال بچھ گیا۔ ان میں ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی سی تھی۔ ان تمام مدارس میں عوامی تعلیم مفت تھی۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔ (الروضتین ج ۱ ص ۲۵۔

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۱۳۷)

اسلامی نظامِ تعلیم کی خصوصیات:

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمی پالیسی کے پیشِ نظر مسلمانوں میں جس نظامِ تعلیم نے رواج پایا اس کے نمایاں خدوخال حسبِ ذیل تھے:

۱۔ یہ نظامِ تعلیم خالص عوامی تھا۔ حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لیے کثیر روپیہ خرچ کرتی تھیں لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ کوئی ایک محکمہ ایسا نہ تھا جو تعلیمی اداروں پر حکومت کی طرف سے نگرانی رکھتا ہو۔ مسلمانوں نے اپنے پورے دورِ حکومت میں کبھی بھی نصابِ تعلیم کو حکومت کے تابع نہیں کیا۔ ہر مدرسہ اپنا نظام چلانے کے لیے آزاد تھا۔ حتیٰ کہ وہ مدارس، جو صرف سرکاری خزانے سے قائم ہوتے تھے، وہاں بھی اساتذہ آزاد تھے مگر تعجب ہے کہ سرکاری مداخلت نہ ہونے کے باوجود نظامِ تعلیم میں غیر معمولی ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ بالکل فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت اور یک رنگی پیدا ہوئی۔ اس آزادی کے باوجود اس طرح کی فطری یگانگت کی مثال بھی دُنیا کے کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔

۲۔ یونان میں آزادی تھی مگر انہوں نے تعلیم کو ایک ذہنی ورزش بنا دیا تھا۔ چین میں تعلیم پر خاندان اور حکومت دونوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ہندو تہذیب میں عمومی تعلیم کا تصور ہی نہ تھا۔ بلکہ ہند میں تعلیم پر پنڈتوں کی اجارہ داری تھی لیکن مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے تعلیم کی حوصلہ افزائی اور غیر معمولی مالی اعانت کے باوجود ایک بالکل آزاد تعلیمی نظام قائم کیا جس میں تعلیم کا محور استاد تھا اور نظم و ضبط کو قائم رکھنے والی قوت، اخلاق کی قوت تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب تجربہ تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی بڑی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج، اکرام الانسانیت اور فرد کی آزادی کا اسلامی تصور، آخرت کی جوابدہی کا احساس اور اسلام کی قائم کردہ معاشرتی جمہوریت ہے جس سے دُنیا کے دوسرے نظام آشنا نہیں۔

۳۔ ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ اس کا اندازہ اس جملے سے کیجئے

جو نظام الملک طوسی نے ملک شاہ سلجوقی کے جواب میں کہا تھا۔ ہُوا یوں کہ شاہ کو ایک موقع پر تعلیم میں غیر معمولی اخراجات سے کچھ تشویش ہوئی، اس نے کہا، اس زرِ کثیر سے تو ایک لشکرِ جرار تیار ہو سکتا ہے۔ نظام الملک نے کہا:

"اے بادشاہ تیری فوج کے تیر تو چند قدم تک کام دے سکتے ہیں لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زمین کے سارے طول و عرض میں مؤثر ہیں اور اُس کی دعاؤں اور حسنات کے تیر تو آسمان کی سپر سے بھی نہیں رُک سکتے۔"

مسلمان حکمران تعلیم کو ایک تجارت نہیں سمجھتے تھے اور نہ خزانے پر اسے ایک بار تصور کرتے تھے۔ بلکہ انہیں یقین تھا کہ یہ دنیا و آخرت دونوں کو بنانے کے لیے ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

برِ عظیم پاک و ہند میں قطب الدین ایبک سے بلبن تک جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے بڑے پیمانے پر مدارس قائم کیے اور مساجد تعمیر کرائیں۔ فیروز تغلق کے بجٹ میں ۱۳۶ لاکھ رُوپے وظائف وغیرہ کے لیے تھے۔ اس کا تقریباً ۲۵ فیصد یعنی ۳۶ لاکھ روپیہ صرف تعلیم کے فروغ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس نے تیس کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قائم کی جس کا سارا خرچ سرکاری خزانے سے پُورا کیا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں میں علم کی سرپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہُوا تھا۔ جہانگیر کا ذوق اس درجہ بڑھا ہُوا تھا کہ بقول مصنف جان جہاں "اس نے ان مدارس کو از سرِ نو تعمیر کروایا جو تیس تیس سال سے بند پڑے تھے اور پرندوں اور جانوروں کی رہائش گاہ بن چکے تھے اور ان کو دوبارہ طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا۔" [1]

جہانگیر نے تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا اور بقول ایچ۔ جی۔ کین (H.G.keane) اس نے لاتعداد اسکول اور کالج قائم کیے۔ محمد شاہ جسے تاریخ "رنگیلا" کے نام سے جانتی ہے، تعلیم پر بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور دار العلوم اسی کی علمی فیاضیوں کا مرہونِ منت تھا [2]

۴۔ ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی، اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے بود و باش اور خورد و نوش کا بھی پُورا انتظام کیا جاتا تھا۔ جیب خرچ کے لیے غریب طلبہ

---

[1] Lows N.N.10. Promotion of learning in India by Muhammedans, P.51.

[2] حوالہ مذکور

کو سرکاری ذرائع اور امراء کی طرف سے وظائف دیے جاتے تھے۔ مدارس اور مساجد میں بڑی تعداد میں کمرے ہوتے تھے جو طلبہ کی رہائش کے کام آتے تھے۔

۵۔ اس نظامِ تعلیم کی ایک اور خصوصیت استاد و شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔ تعلیم کے محور اساتذہ تھے اور ان کو معلّم و مربّی کی حیثیت حاصل تھی۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا ان کے ایثار و قربانی اور اخلاص کا حال پڑھ کر تعجب ہوتا تھا کہ اسلام کیسے کیسے نمونے تیار کر سکتا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیسا تھا۔ اس کا اندازہ مشہور عالم حکیم علی گیلانی کے بارے میں "تذکرہ علمائے ہند" کے اس فقرے سے کیجئے:

"ہمیشہ طلبہ کو درس دیا کرتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔"

(منتخب التواریخ ص ۸)

۶۔ اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد کا قلبی تعلق ہی نہ تھا بلکہ استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاحِ باطن کی فکر بھی کرتے تھے۔ انہیں ہر وقت یہ خیال دامنگیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیارِ علم ہی بلند نہ ہو، ان کا معیارِ اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں۔ اگر اس معاشرے میں تقوائے، ایفاءِ عہد، عصمت و عفت، ایثار و قربانی، صلہ رحمی، اخلاق و مروّت اور ہمدردی و اخوت کا دور دورہ تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرتی تھی۔

۷۔ اس نظامِ تعلیم کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں جمود نہ تھا۔ یہ نظام نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض حجروں کی زینت نہ تھے، بلکہ نظامِ سلطنت کو حکمت و دانشمندی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ اگر درخت کو اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو اس نظام کو ان شخصیات سے پرکھا جا سکتا ہے جنہیں اس نے تیار کیا اور جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نام پیدا کیا۔ غرض یہ کہ تعلیمی نظام کی جس تاریخی روایت کا آغاز رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہوا تھا، ہنوز رُوبارتقاء ہے اور مفید برگ و بار پیدا کر رہی ہے۔